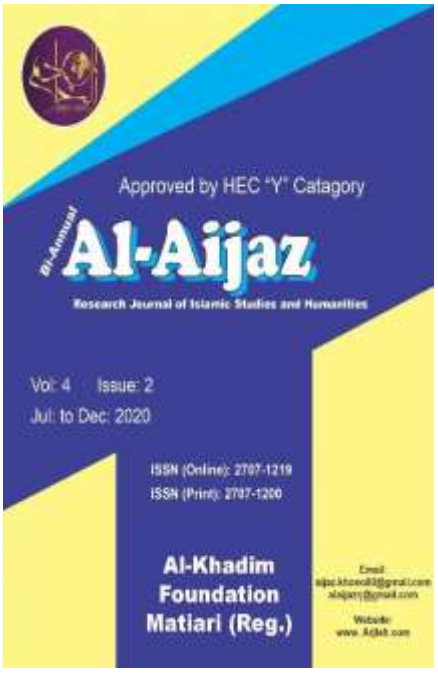
Al-Aijaz Research Journal of Islamic Studies & Humanities
(Bi-Annual) Trilingual: Urdu, Arabic and English
ISSN: 2707-1200 (Print) 2707-1219 (Electronic)
Home Page: http://www.arjish.com
Approved by HEC in "Y" Category
Indexed with: IRI (AIOU), Australian Islamic Library, ARI, ISI, SIS, Euro pub.
Published by the Al-Khadim Foundation which is a registered organization under the Societies Registration ACT.XXI of 1860 of Pakistan
Website: www.arjish.com
Copyright Al Khadim Foundation All Rights Reserved © 2020
This work is licensed under a
Creative Commons Attribution 4.0 International License



TOPIC:

The Existential Condition in N. M. Rashed's Work: An Analytical Overview

AUTHORS:

Syed Shabbir Hussain Bukhari (Sham Bukhari)

Ph.D Scholar, Urdu, Univeristy of the Punjab, Lahore

How to cite:

Mehboob, M. S., & Ahmed, H. I. (2020). U-27 The Existential Condition in N. M. Rashed's Work: An Analytical Overview. *Al-Aijaz Research Journal of Islamic Studies & Humanities*, *4*(2), 406-423. https://doi.org/10.53575/u27.v4.02(20).406-423

Vol: 4, No. 2 | July to December 2020 | Page: 406-423

Published online: 2020-12-20

ن م راشد کے ہاں وجودی صورتحال: تجزیاتی جائزہ

The Existential Condition in N. M. Rashed's Work: An Analytical Overview

Syed Shabbir Hussain Bukhari (Sham Bukhari)*

Abstract
Generally speaking, N.M Rashid (1910 - 1975) is known as one of the leading modern poets in Urdu Literature. In the article under discussion, the writer has tried to trace out the elements of Existentialism in Rashid's poetry. It has been tried to establish the fact how Rashid was influenced by the Movement of Existentialism and exploits it in his poetry. He very deeply feels that the man of his era especially in his region is facing all those elements which have been the core issues that were brought under discussion in existential philosophy. All those problems which the modern man encounters in the form of social religious and cultural chains have been located diligently found is N.M Rashid's Poetry and presented to the readers of this article. He inspires the modern man to break all those chains and pave his own path to his final goal that does not demand guidance from external world. He wants to see the man of new age as the founder of his distiny since no one can help him out in the solution of the problems created by the world around him. He tries to make him realize that divinity does not play any role is creating or solving the calamities being faced by him.
Keywords: Modern stylistics, self-alienation, social rebellion, suicidal desire, post-critical trends, globalization, coercion and violence, anarchy, decline of thought.

وجودیت کا فلسفہ خالصتاً مغربی فلسفہ ہے۔ یہ ابتداً ایک فلسفہ تھا جو بتدریج وسعت پذیر ہو کر تحریک کی شکل اختیار کر گیا۔ اس فلسفہ کے بنیاد گزاروں کے انفرادی مطالعہ سے وجودیت کے کئی شیڈز سامنے آتے ہیں لیکن اگر اس کا مطالعہ بطور تحریک کیا جائے تو وہی شیڈز ایک وحدت میں ڈھل کر تحریک بن جاتے ہیں۔ "مذہبی وجودیت" اور "ملحدانہ وجودیت" کی تقسیم کے ساتھ بھی اس کی تفہیم کی کوشش کی گئی۔ زیرِ نظر مضمون میں وجودیت بطور تحریک زیرِ بحث رہے گی اور ن۔ م راشد کی نظم پر اس کے اثرات کا جائزہ لیا جائے گا۔

وجودیت کی تفہیم کے لیے وجودیت بطور فلسفہ، تحریک اور اس کی مقبولیت کے اسباب کے درمیان فرق روا رکھنا بہت ضروری ہے۔ عام طور پر وجودیت کو دوسری جنگ عظیم کی پیداوار قرار دیا جاتا ہے۔ یہ التباس دوسری جنگ عظیم کے بعد پیدا ہونے والی صورت حال اور وجودیت کے افکار کی ظاہری مماثلت سے پیدا ہوا۔ جب کہ یہ خیال کچھ زیادہ مبنی بر صداقت نہیں ہے۔ درحقیقت وجودیت کی ابتدا سورین کرکے گارڈ (۱۸۱۳ء۔ ۱۸۵۵ء) کے افکار سے ہوئی اور فریڈرک نطشے (۱۸۴۴ء۔ ۱۹۰۰ء) نے بطور فلسفہ اس کی تنظیم کی۔ ان ابتدائی مفکرین کا زمانہ جنگ عظیم سے پہلے کا زمانہ تھا اور ان کے دور میں بلاشبہ وہ صورت حال بالکل بھی نہیں تھی جو آنے والے وقت میں عظیم جنگوں سے پیدا ہونے والی تھی۔

* Ph.D Scholar, Urdu, Univeristy of the Punjab, Lahore

ان دونوں مفکرین کو اپنے افکار کے سبب شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا، سنکی اور خبطی کے خطابات بھی ملے لیکن یہ فلسفی عام زمانی روش سے ہٹ کر چلتے رہے ان کے انفرادی مطالعے کا یہ محل نہیں ہے۔ بہر حال یہ طے ہے کہ اس فلسفہ کو مقبولیت دوسری عالمی جنگ کے بعد ملی۔ کرکے گارڈ اور نطشے کے علاوہ مارٹن ہائیڈیگر، کارل جیسپر، جبریل مارسل، ژاں پال سارتر، البرٹ کامیو اور کولن ولسن نے اس فلسفے کو اس دور کی نمائندہ تحریک بنادیا۔ وجودیت کا فلسفہ کوئی باقاعدہ نظریہ زندگی یا نظام زندگی نہیں دیتا بلکہ طرز حیات پر بات کرتا ہے لہٰذا کہا جاسکتا ہے کہ یہ صورت حال کا فلسفہ ہے، اصول وضوابط میں جکڑا ہوا کوئی نظریہ نہیں۔ وجودیت باقاعدہ نظام کی مخالف اور موضوعیت کی داعی ہے اسی بنا پر وجودیت کا اصرار ہے کہ صداقت موضوعی ہے اور تمام صداقتوں کا پیمانہ فرد ہے۔ اس طرز عمل کے پیچھے رومانویت کی مہیا کردہ مضبوط بنیادیں ہیں جس نے فرد کو موضوع بنایا لہٰذا اسے فرد کا فلسفہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ اسی بنیادی فکر کی بنا پر یہ بشر مرکزیت منشور کے بیشتر حصے سے متفق ہے۔

انسانی آزادی وجودیت کا بنیادی موضوع ہے۔ اس نے نہ صرف انسان کو ذمہ دارانہ آزادی کا احساس دلایا بلکہ یہ بھی باور کرایا کہ انسان ہر طرح کے جبر اور ہر نوع کی پابندیوں (مذہب، معاشرہ اور اقدار وغیرہ) سے مطلق آزاد ہے۔ وجود کے تقدم پر اصرار دراصل جوہر کی تخلیق میں درپیش مسایل کی نفی اور انسان کے خود مختار ہونے پر دال ہے۔ وجودیت کو بلا مبالغہ انسانی عظمت کا فلسفہ قرار دیا جاسکتا ہے جو تجریدیت کو بے دخل کرکے صرف انسان کو موضوع بناتا ہے۔

وجودیت کا اصرار ہے کہ مذہب، سائنس اور فلسفہ انسانی رہبری میں ناکام ہوچکے اور اب تمام ذمہ داری انسان پر آپڑی ہے لہٰذا انسان کے پاس خدائی منصب پر متمکن ہونے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ انسانی فطرت طے شدہ ہے اور نہ ہی تقدیر بلکہ انسان اسے خود اپنے اعمال سے بناتا ہے اور اس سلسلہ میں جنیٹکس، حالات یا ماحول کا کوئی جبر نہیں۔ وجودیت خارج سے داخل کی تعلیم دیتی ہے کیوں کہ داخل سے ہی فرد اپنے اصول واقدار وضع کرتا ہے جن کے مطابق وہ زندگی گزارتا ہے کیوں کہ وہ اپنے ہر عمل کا خود ذمہ دار ہے۔ انسان کو خدا کی مسند پر بٹھانے کے بعد وجودیت نے ہر اس صورت حال پر بات کی جس سے انسان دوچار ہوسکتا ہے۔ سب سے پہلے انسان کو کامل آزادی کا یقین دلایا اور ورائے انسان طاقتوں کی نفی کی (اس سلسلہ میں خاطر نشیں رہے کہ نطشے جب مرگِ خدا کا اعلان کرتا ہے تو دراصل انسان کی آزادی اور تحرک میں حایل عنصر کے طور پر کرتا ہے تاکہ انسان کو فوق الانسان بننے میں کوئی رکاوٹ محسوس ہو اور نہ ہی اس سے برتر کسی ہستی کا جبر ہو) یہی سبب ہے کہ وجودیت نے فرسودہ روایات واقدار سے بڑے پیمانے پر بغاوت کی علاوہ ازیں انسان کی ازلی تنہائی اور تشویش کو موضوع گفتگو بنایا۔

ن۔ م راشد جدید اردو نظم کے بنیاد گزاروں میں مرکزی حیثیت کے حامل ہیں۔ اُنھوں نے جدید نظم کو نہ صرف مضبوط بنیادیں فراہم کیں بلکہ اسے فکری وہیئتی وسعتوں سے ہم کنار بھی کیا۔ "ماورا" سے "گماں کا ممکن" تک کی شعری مسافت میں راشد نے بیشتر مقامات پر نظم کی

سابقہ روایت سے انحراف و اجتہاد کیا۔ راشد کی نظم جدید انسان اور اس کے مسایل سے گہری دلچسپی رکھتی ہے۔ وہ عملی زندگی میں کہنگی اور فرسودگی سے بے زار رہے اور کچھ ایسی ہی فضا ان کی نظم میں بھی نظر آتی ہے۔

ان کی تخلیقی فکر جدید علوم سے متاثر ہوئی جس کا اظہار ان کی تخلیقات میں دیکھا جا سکتا ہے۔ دیگر جدید مباحث کے ساتھ ساتھ وجودیت نے بھی ان کے تخلیقی دھارے کو شدت سے متاثر کیا نتیجتاً وجودی مباحث ان کی نظم میں راہ پاتے گئے۔ راشد اپنے بیشتر ہم عصروں کے برعکس عصری تقاضوں کا نہ صرف شعور رکھتے تھے بلکہ آنے والے وقت میں انسانی زندگی کو پیش آنے والی صورت حال کو بھی دیکھ رہے تھے۔

وجودیت کی تحریک اور راشد کی فکر میں بہت سے اشتراکات ہیں یہی سبب ہے کہ جن خطوط پر وجودیت بات کرتی ہے راشد کی نظم بھی انھیں کی پرچارک ہے۔ وجودیت انسانی عظمت کی داعی ہے اور راشد کے ہاں بھی انسان دیگ مظاہرِ کائنات میں سب سے ارفع ہے:

بُوئے آدم زاد آئی ہے کہاں سے ناگہاں؟
دیو اِس جنگل کے سناٹے میں ہیں
ہو گئے زنجیرپا خود ان کے قدموں کے نشاں
ایک سایہ دیکھتا ہے چھپ کے ماہ و سال کی شاخوں سے آج
دیکھتا ہے بے صدا، ژولیدہ شاخوں سے انھیں
ہو گئے ہیں کیسے اِس کی بُو سے ابتر حال دیو
بن گئے ہیں موم کی تمثال دیکھ
ہاں اُتر آئے گا آدم زاد ان شاخوں سے رات
حوصلے دیووں کے مات (1)

وجودی فلسفہ دعویٰ کرتا ہے کہ انسان سب سے زیادہ طاقت رکھنے والی مخلوق ہے۔ انسان کا خود سے کئی گنا زیادہ طاقت رکھنے والی اشیا پر قابو اِس کا ثبوت ہے کہ آدم زاد سے بڑھ کر کوئی قوی و توانا نہیں ہے۔ یہ آدم اگر پورے ارادے کے ساتھ کھڑا ہو جائے تو دیو موم کی تمثال پیش کرنے لگتے ہیں اور ان کے حوصلے مات ہو جاتے ہیں۔ نشینِ خاطر رہے یہاں روایتی اور پرانے انسان کی بات نہیں ہو رہی جو تقدیر کے فیصلوں پر سر جھکانے کا عادی تھا بلکہ اُس نئے انسان کا ذکر ہے جو ڈارون کے انسان (Man) سے بڑھ کر نطشے کے فوق الانسان (Super Man) کا مقام پا چکا ہے، پوری کاینات جس کے فیصلوں کی مطیع ہے، ایسے انسان کو راشد "بیش بہا" انسان کہتے ہیں ملاحظہ ہو: کیا یہ کہنا جھوٹ تھا، اے جاں:

انساں سب سے بیش بہا ہے
کیوں اس کی رسوائی ہو

بے بصری کے بازاروں کی بے مایہ دکانوں میں
کیا یہ کہنا جھوٹ تھا، اے جاں:
ہم سب فرد ہیں، ہم پر اپنی ذات سے بڑھ کر
کس آمر کی دارائی ہو
کیا یہ کہنا جھوٹ تھا، اے جاں:
ہم سب ہست ہیں، ہم کیوں جاں دیں
مذہب اور سیاست کے نابُودوں پر
موہوموں کو فوقیت دیں
آگاہی کی آنکھوں سے، موجودوں پر؟(2)

وجودیت اور راشد متفق ہیں کہ انسان سب سے بیش بہا ہے۔ انسان کائنات میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے مگر صنعتی جبر نے اس کو نہ صرف بے توقیر کیا بلکہ کوشش کی کہ اس کے تشخص کا خاتمہ کر کے اُسے مشین میں ڈھال دیا جائے۔ راشد اس رسوائی کو برداشت نہیں کر پا رہے۔ وہ بحیثیتِ فرد انسان کو آزاد اور قادرِ مطلق دیکھنا چاہتے ہیں۔ انسانی تشخص کے تعین میں 'انفرادیت' بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ راشد انسان کی انفرادیت کو سب سے ضروری خیال کرتے ہوئے اسے مذہب اور سیاست کے نابودوں سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں کیوں کہ یہ دونوں دبستان اجتماعیت کا ایک سَیل لیے ہوئے ہیں جو سب سے پہلے انفرادیت کو نگلے گا اور آن کی آن میں تشخص کا خاتمہ کر دے گا جو عظمتِ انسان کے منافی ہے۔ راشد کے ہاں انسان اِس کائنات کا مرکزی کردار ہے، ایسا کردار جو بے معنویت کو معنویت عطا کرتا ہے اور راشد پکار اٹھتے ہیں:

اُبھرا تھا جو آواز کے نابود سے
اِک زمزمے کا ہاتھ
وہ ہاتھ خداوندِ ستم گر کا نہیں تھا
وہ ہاتھ گدا پیشہ پیمبر کا نہیں تھا
اُس ہاتھ میں]تم دیکھتے ہو[
شمع کی لرزش ہے، جو کہتی ہے کہ:
"آؤ،
شاہراہ پہ بکھرے ہوئے اوراق اٹھاؤں

اِس ہاتھ سے لکھو" کہتی ہے کہ "آؤ،
ہم تم کو نئے زینوں کے،
آئینوں کے، باغوں کے،
چراغوں کے، محلوں کے، ستونوں کے
نئے خواب دکھائیں"(3)

راشد کا انسان اپنا خدا آپ ہے، جسے رہبری کی ضرورت نہیں بلکہ وہ تو سراپا "کُن" ہے۔ نئے نئے راستے تراشتا اور کائنات میں ہر جگہ اپنی عظمت کی مہریں ثبت کرتا چلا جاتا ہے۔ اس کائنات کا اگر کچھ مفہوم ہے تو وہ اسی انسان کا عطا کردہ ہے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسا انسان پیدا کیسے ہوا؟ بنا کیسے؟ ایسی عظمت و رفعت انسان کو کیوں کر ملی؟ یقیناایسی عظمت کا حصول بہت جان جوکھوں کا کام ہے۔ اس کے لیے بڑے پیمانے پر بغاوت درکار ہے۔ تمام ایسے عناصر سے بغاوت جو اس کی راہ میں روڑے اٹکاتے ہیں۔ مذہب، سماج اور اقدار سے بغاوت کے ساتھ ساتھ تمام طرح کے سہاروں سے منہ موڑنا پڑتا ہے تب جا کے کہیں اُس انسان کا ظہور ہوتا ہے جس کو نطشے "فوق الانسان" کا نام دیتا ہے اور راشد نئے آدمی کا۔ سخت صعوبت اور ریاضت کے بعد انسان اس مقام پر پہنچتا ہے جہاں اُس کا "گمان" بھی "یقین" کا درجہ اختیار کرلیتا ہے جیسے کہ راشد "نیا آدمی" میں کہتے ہیں:

نئے آدمی کے گماں بھی یقیں
گماں جن کا پایاں نہیں
گمانوں میں دانش(4)

راشد انسان کو کائنات کی سب سے عظیم ہستی سمجھتے ہیں اور اسے طاقت و اختیارات کا منبع قرار دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ انسان سے اورا تمام قوتوں کی نفی کرتے ہیں۔ اِس داعیہ میں وہ وجودیت کے فلسفہ سے پوری طرح متفق ہیں کہ انسان تمام طرح کے اختیارات کا حامل ہے اور انسان سے ماورا کوئی ہستی نہیں جو اُس سے برتر و اعلیٰ ہو یہی خیال ان کے لہجے میں تیقن لے آیا ہے :

شکر ہے زندانیءاہریمن ویزداں نہیں
ان سے بڑھ کر کچھ بھی وجہ کاہشِ انساں نہیں
مَیں مگر ان کے افق سے دور اک سیارہ ہوں(5)

ایک آزاد انسان جو تمام طرح کے سہاروں سے بے نیاز ہو چکا ہے، نہ اُسے اہرمن کا ڈر ہے نہ یزداں کا، بلکہ وہ تو ان کے وجود کو اپنے لیے کمزوری خیال کرتا ہے۔ شکر بجالاتا ہے کہ وہ ان کی تعلیمات اور احکامات کا پابند نہیں بلکہ ایک آزاد انسان ہے جو اپنے قائم کردہ

مدار میں زندگی گزار رہا ہے۔ آزادی کی نعمت کو بروئے کار لاتے ہوئے راشد نہ صرف خود ایسے طرزِ زندگی کو پسند کرتے ہیں بلکہ دوسروں کی رہبری بھی کرتے ہیں:

اتفاقات کو دیکھ
اس حسیں رات کو دیکھ
توڑ دے وہم کے جال
تجھ کو کیا اس سے غرض ہے کہ خُدا ہے کہ نہیں ہے؟
اک نئی زیست کا در باز کریں
آسماں دور ہے لیکن یہ زمیں ہے نزدیک
آ اِسی خاک کو ہم جلوہ گہِ زار کریں
اور خدا ہے تو پشیماں ہو جائے(6)

یہ آزادی ہی ہے جسے استعمال کرتے ہوئے راشد نئی زندگی کا در باز کرنا چاہ رہے ہیں۔ اور مشورہ دے رہے ہیں کہ خُدا کے ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر خدا ہے بھی تو انسان کو اپنی آزادی استعمال کرتے ہوئے اپنے فیصلوں سے اُسے پشیمان کر دینا چاہیے۔

فلسفہ وجودیت کے تحت جملہ بغاوت کی اساس، انسانی آزادی ہے۔ کوئی فلسفہ، خیال یا وجود جو انسانی ارادوں کے لیے حدود کا تعین کرتا ہے، وجودیت کا فلسفہ فوراً اُس کی نفی کرتا ہے۔ اس کا اصرار ہے کہ تمام طرح کی صورتِ حال کا ذمہ دار انسان خود ہے۔ کسی اور ہستی کو موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ راشد بھی انسان کی کامل آزادی پر یقین رکھتے ہیں لہٰذا خدا کا ہونا یا نہ ہونا اُن کے نزدیک کوئی معنی نہیں رکھتا۔ وہ فرسودہ خیالات کے حامل انسان پر تاسف کرتے ہوئے کہتے ہیں:

آہ انساں کے ہے وہموں کا پرستار ابھی
حسن بے چارے کو دھوکا سا دیئے جاتا ہے
ذوقِ تقدیس پہ مجبور کیے جاتا ہے
ٹوٹ جائیں کے کسی روز مزامیر کے تار
مسکرا دے کہ ہے تابندہ ابھی تیر اشباب
ہے یہی حضرتِ یزداں کے تمسخر کا جواب(7)

راشد کو یقین ہے کہ انسان جوں ہی عرفانِ ذات پائے گا تو وہموں کا طوق اتار پھینکے گا جو اس کی راہیں مسدود کیے ہوئے ہے۔ مذہب، سماجی روایات و اقدار کی زنجیریں دراصل اس کے وہمے ہی تو ہیں، جو اس کی انفرادیت کو دبائے اور آزادی کو سلب کیے ہوئے ہیں۔ راشد نئے

انسان کو ترغیب دے رہے ہیں کہ تمھیں تمام فرسودہ روایات و اقدار کی قید سے آزاد ہو کر اپنی اقدار تشکیل دینی چاہییں۔ اپنے معیار کے مطابق زندگی بسر کرنا اور اپنا خدا آپ بننا ضرورتِ وقت ہے۔ کیوں کہ یہی حقیقی طرزِ زندگی ہے۔ "خُدا" کا لفظ دراصل غیبی امداد کا استعارہ ہے، جو کہ وجودِ حقیقی سے مُبرّا ہے۔ غیب پر ایمان رکھتے ہوئے حقیقت سے آنکھیں بند نہیں کی جاسکتیں، یہی وجودی طرز ہے۔ نظم "انسان" میں وہ خُدا سے شکوہ کناں ہیں۔

الٰہی تیری دنیا جس میں ہم انسان رہتے ہیں
غریبوں، جاہلوں، مُردوں کی، بیماروں کی دُنیا ہے
یہ دُنیا بے کسوں کی اور لاچاروں کی دنیا ہے
بنالی اے خُدا اپنے لیے تقدیر بھی تو نے
اور انسانوں سے لے لی جراتِ تدبیر بھی تو نے
یہ داد اچھی ملی ہے ہم کو اپنی بے زبانی کی
کسی سے دور یہ اندوہِ پنہاں ہو نہیں سکتا
خُدا سے بھی علاجِ دردِ انساں ہو نہیں سکتا (8)

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جہاں تقدیر کا تصور رواج پا جائے وہاں تدبیر کی نبضیں رکنے لگتی ہیں۔ تصورِ خُدا اور تصورِ تقدیر لازم و ملزوم ہیں، لہٰذا راشد آزادیء عمل کی سلبی پر تلخ ہو گئے ہیں اور خُدا سے شکوہ کناں ہیں کہ یہ تُو نے کیا کیا ہے؟ لیکن آخر ایک نتیجے پر پہنچے ہیں کہ انسان کی پریشانیوں اور دکھوں کا علاج خُدا کے پاس نہیں۔ خُدا مجبورِ محض ہے اور انسان مطلق آزاد، اور کسی طرح کی پابندی اس کی راہ میں حائل نہیں۔

مَیں نہ جاؤں گا تو دُشمن کو شکست
آسمانوں سے بھلا آئے گی؟(9)

سپاہی نظم کے ان مصرعوں میں تحرک اور فعالیت کا وہی جذبہ دکھائی دے رہا ہے جو نئے انسان سے مخصوص ہے۔ راشد اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ اصلیت "عمل" میں ہی ہے، اس کے علاوہ تمام حیلے اور سہارے بے معنی ہیں۔ آسمانوں سے معجزے رونما نہیں ہوتے، انسان معجز نُما ہے۔ تمام بساط انسان ہی کی بچھائی ہوئی ہے، کسی مابعد الطبیعاتی طاقت کا اس میں عمل دخل نہیں ہے۔ جیسے کہ وہ اپنی نظم "گناہ" میں کہتے ہیں:

کون جانے کہ وہ شیطان نہ تھا
بے بسی میرے خُداوند کی تھی (10)

وجودیت کا فلسفہ کسی غیر مرئی وجود سے بحث نہیں کرتا۔ یہ فلسفہ تو صرف موجودات پر بات کرتا ہے، باقی تمام عناصر کو افسانوی کھاتے میں ڈال کر خارج از بحث قرار دیتا ہے۔ راشد نے شیطان کے وجود کی نفی کی ہے لیکن اُن کا پیرایہ طنزیہ ہو گیا ہے کہ تمام اختیارات رکھنے کے باوجود بھی خدا، شیطان پر قابو نہ پا سکا اور یوں شیطان خُدا کی بے بسی کی علامت بن گیا۔ راشد انسان کو آزاد ثابت کرنے کا کوئی موقع بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ ایسا صرف فکری سطح پر ہی نہیں، ان کی عملی زندگی بھی ہر طرح کی پابندیوں کے خلاف جدوجہد کا مرقع ہے۔ وہ گہرا ادراک رکھتے ہیں کہ بندگی سے کچھ حاصل نہیں ہونے والا، تبھی تو وہ کہتے ہیں:

عہدِ پارینہ کا مَیں انسان نہیں
بندگی سے اس درِ دیوار کی
ہو چکی ہیں خواہشیں بے سوز و رنگ و ناتواں (11)

راشدؔ جانتے ہیں کہ وہ پرانا انسان تھا آسمان جس کی رہبری کرتا تھا، عہدِ حاضر کے انسان کے مسائل کا حل کسی ماورائی طاقت کے بجائے خود اُسی کے پاس ہے۔ اس لیے راشدؔ بندگی سے مایوس ہو چکے ہیں اور اِس بندگی سے منسلک خواہشات کو ختم کر چکے ہیں۔

فوق البشر سے مراد نیا انسان ہے جو اپنی صلاحیتوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور اپنے مسائل کا حل بہت اچھی طرح جانتا ہے۔ راشدؔ بھی اپنے دور کے مسایل کا شعور رکھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ ان مسایل کا حل صرف انسان کے پاس ہے یہی وجہ ہے کہ وہ انسان کے علاوہ تمام طاقتوں سے بغاوت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ خُدا، جو طاقت اور مدد کی سب سے بڑی علامت (Symbol) ہے، راشدؔ نے بیشتر مقامات پر اس کی نفی کرتے اور نئے انسان کی عظمت اور رفعت کے ترانے گاتے نظر آتے ہیں جیسے وہ "شاعرِ درماندہ" میں کہتے ہیں:

تجھے معلوم ہے مشرق کا خُدا کوئی نہیں
اور اگر ہے، تو سرِ پردہءنسیان میں ہے
تُو "مُسرت" ہے مری، تُو مری "بیداری" ہے
مجھے آغوش میں لے
دو "انّا" مل کے جہاں سوز بنیں
اور جس عہد کی ہے تجھ کو دعاؤں میں تلاش
آپ ہی آپ ہویدا ہو جائے (12)

اس نظم میں قاری طنز کی کاٹ کو محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا، راشدؔ اعلان کر رہے ہیں کہ مشرق کا خُدا نہیں ہے۔ یہاں مشرق کا خدا نہ ہونے کی بات، ساکنانِ مشرق کی زبوں حالی کے باعث ہے۔ اور اس زبوں حالی کا سبب فرسودہ نظریات و اقدار کو حرزِ جاں بنائے رکھنے کا رویہ ہے۔ راشد ہر اس رویے کے خلاف ہیں جو نسیان کا پیدا کردہ ہے۔ انھیں تو ہر صورت بیداری عزیز ہے، یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ

راشد ؔ اتنی شدومد سے خدا کی نفی کرتے ہیں تو اس کی غایت خدا سے دشمنی نہیں بلکہ انسان کو یہ باور کرانا ہے کہ وہ خود مکتفی ہے۔ اپنی روایات و اقدار وقت کے تقاضوں کے تحت تشکیل دینے میں آزاد ہے، بلکہ وجودیت کا اصرار ہے کہ ہر انسان کو اپنی اقدار خود تخلیق کرنی چاہییں۔

فرد جب آزادی کو استعمال کرتے ہوئے فیصلے کرتا ہے تو مذہب اور قدیم روایات و اقدار کے ساتھ ساتھ دیگر عوامل مختلف صورتوں میں آڑے آتے ہیں۔ مذہبی معاشروں میں تہذیب اور روایات و اقدار کا تعین خاصی حد تک مذہب کرتا ہے۔ تمام سماوی اور کچھ ارضی مذاہب کا ماخذ خُدا ہے لہٰذا انسان کی آزادی و خود مختاری میں "تصورِ خدا" اک رکاوٹ ہے جب تک اس رکاوٹ کو ختم نہ کیا جائے انسانی آزادی نامکمل ہے۔

راشدؔ انسان کی کامل آزادی کے خواہاں ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ سب سے اعلیٰ و ارفع منصب "خُدائی منصب" ہے۔ وہ متمنی ہیں کہ اس منصبِ عظیم پر انسان ظہور پذیر ہو، کیوں کہ اسی کے دم سے اس بے ربط کائنات میں ربط ہے۔ اس ضمن میں عالم خوندمیری، راشد کے بارے میں رقم طراز ہیں:

"راشدؔ نے انسان پر اپنے اعتماد کو ختم نہیں کیا۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ خُدا نے انسان کو مایوس کر دیا ہے لیکن اس کا علاج یہ نہیں ہے کہ انسان اپنے آپ سے کنارہ کش ہو جائے۔ خدا سے انسان یقیناً ہمت ہار چکا ہے۔ اب انسان اپنے سفر میں خدا کی حاجت محسوس نہیں کرتا۔ لیکن خدا کی یہ غَیبت (Absence) انسان کے لیے ایک چیلنج ہے۔ اگر خدا انسان سے کنارہ کش ہو گیا ہے تو انسان کو اسے ایک چیلنج کے طور پر قبول کرنا ہے۔ یہ ایک موقع ہے اپنے آپ کے اقرار کا اور "رحم مادر" سے نکل آنے کا اور اپنی آزادی کے اقرار کا۔ اس بے خدا دور میں انسان کو خُدا کے برابر ہونا ہے۔ انسان ہی اس خلا کو پُر کر سکتا ہے"۔(13)

راشد کا نیا انسان مسایل کو شکست دے کر بالآخر اپنے عمل سے یہ ثابت کر دیتا ہے کہ وہ خُدا بننے کا اہل ہے۔ ذرا اک نظر "حسن کوزہ گر" پر ڈالیں جس کے کوزے سر گوشیوں میں کہہ رہے ہیں:

"حسن کوزہ گر اب کہاں ہے؟
وہ ہم سے خود اپنے عمل سے
خداوند بن کر خداؤں کی مانند ہے روئے گرداں!" (14)

ایک اور نظم "پہلی کرن" میں راشد کہہ رہے ہیں:

خدا کا جنازہ لیے جا رہے ہیں فرشتے
اسی ساحرِ بے نشاں کا
جو مغرب کا آقا تھا مشرق کا آقا نہیں تھا

یہ انسان کی برتری کے نئے دور کے شادیانے ہیں، سن لو
یہی ہے نئے دور کا پرتوِ اوّلیں بھی
اٹھو اور ہم بھی زمانے کی تازہ ولادت کے اس جشن میں
مل کے دھومیں مچائیں
شعاعوں کے طوفان میں بے محابا نہائیں(15)

نئے انسان نے منصبِ خداوندی پہ بیٹھ کے نہ صرف اس کے تقاضے پورے کیے بلکہ اپنے آزادانہ فیصلوں سے ثابت کیا کہ وہ اس مقام و مرتبہ کا اہل ہے۔ اس کائنات کو رنگ و نور سے بھر دیا، ناممکنات کو ممکنات بنایا، بے نام اشیا کو نام دیئے، کائناتی ارتباط کو موثر اور منضبط بنایا۔ نئے علوم و فنون کے در وا کیے، فکرِ انسان کو تازہ خطوط میسر آئے اور ہر طرف "کُن کُن" کی صداؤں کا شور بپا ہوا۔

"ہمارے تمام تر تصورات اس شعوری عمل سے تشکیل پاتے ہیں کہ انسانی حقیقت "انکشاف کنندہ ہے۔ مراد یہ کہ "ہونے "کا ثبوت انسانی حقیقت کی وساطت سے ملتا ہے۔ اسے دوسرے انداز میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ انسان وہ ذریعہ ہے، جس کے وسیلے سے اشیا اپنا مفہوم پاتی ہیں۔ یہ دنیا میں ہماری موجودگی ہے جو تعلقات کو وسعت دیتی ہے۔ یہ ہم ہی ہیں، جنھوں نے اس درخت اور اس آسمان کے درمیان ایک ربط قائم کیا ہے۔ ہمارا شکریہ ادا کیا جانا چاہیے کہ ہم نے ہزاروں سال مردہ پڑے ہوئے ستارے، بجھے ہوئے چاند اور تاریک دریا کو لینڈ سکیپ کی ایک وحدت کے طور پر آشکار کیا۔ یہ ہماری کار اور ہوائی جہاز کی رفتار ہے، جس نے زمین کی عظیم وسعتوں کو ایک تنظیم عطا کی ہے۔ ہمارے ہر عمل سے کائنات ہمارے سامنے نئے چہرے منکشف کرتی ہے"(16)

راشدؔ کی نظم میں جہاں نئے آدمی اور اس کی فسوں کاریوں کا ذکر ہے وہاں اس آدمی کا بھی ذکر ہے جو غیر تحرکی اور غیر فعالیت سے زندگی گزار رہا بلکہ زندگی اسے گزار رہی ہے۔ راشدؔ ایسے انسانوں سے سخت نالاں ہیں جو غیر حقیقی زندگی گزار رہے ہیں۔ وہ ایسے انسانوں کی موت سے ملاقات کے متمنی ہیں:

اجل، ان سے مل
کہ یہ سادہ دل
نااہلِ صلوٰۃ اور نہ اہلِ شراب،
نہ اہلِ ادب اور نہ اہلِ حساب
نہ اہلِ کتاب
نہ اہلِ کتاب اور نہ اہلِ مشین
نہ اہلِ خلا اور نہ اہلِ زمین

فقط بے یقین
نہ کشکولِ دریوزہ گر دی چھپاؤ
تمھیں زندگی سے کوئی ربط باقی نہیں
اجل سے ہنسو اور اجل کو ہنساؤ
بڑھو، بندگانِ زمانہ بڑھو بندگانِ درم
اجل، یہ سب انسان منفی ہیں
منفی زیادہ ہیں، انسان کم
ہو ان پر نگاہِ کرم!(17))

پوری نظم منفی انسانوں سے متعلق ہے۔ راشدؔ کے نزدیک منفی انسان سے مراد ایسا انسان ہے جو انفرادیت کھو کر غیر حقیقی زندگی گزار رہا ہے۔ لوگوں کا ایسا گروہ جو ذمہ داری اور آزادی کا شعور نہیں رکھتا اور انفعالی زندگی گزار رہا ہے۔ جن کا اپنا نظریہ زندگی نہیں بلکہ وہ کہنہ و فرسودہ روایات کے سیلاب میں بہے جا رہا ہے۔ راشدؔ کے نزدیک ایسے لوگوں کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ انھیں جتنی جلدی ممکن ہو موت سے ملاقات کرنی چاہیے کیوں کہ ایسے لوگ مُردوں کی طرح زندگی گزار رہے ہیں۔ مارٹن ہائیڈیگر اس طرزِ زیست پر کہتا ہے:

بالقوہ وجود کے طور پر انسان ایک راستہ اختیار کرنے پر مجبور نہیں۔ وہ انتخاب کر سکتا ہے اور اس کے سامنے دو راستے ہیں۔ یا تو وہ عوام الناس میں گھل مل کر انفرادیت سے محرومہو جائے، ذاتی ذمہ داری و خود مختاری سے دستبردار ہو کر اجتماعی یقین حاصل کر لے۔ یا پھر ذمہ داری اور خود مختاری سے اپنی راہ تلاش کر لے۔ پہلی صورت میں اس کی زندگی بے معنی و غیر حقیقی ہو گی اور دوسری صورت میں با معنی و حقیقی"۔

غیر حقیقی زندگی گزارنے والوں کا ذکر راشد کے ہاں متعدد مقامات پر ہوا ہے، "افسانہ شہر" میں دیکھیے:

جائیں اب تازہ و نادیدہ نگاہوں کے زمستاں میں کہاں
اس اسیروں کی طرح جن کے لیے وقت کی بے صرفہ سلاخیں
نہ کبھی سرد نہ گرم، اور نہ کبھی سخت نہ نرم
نہ رہائی کی پذیرا، نہ اسیری ہی کی شرم!
شہر کے شہر کا افسانہ، وہ روحیں جو سرِ پل کے سوا
اور کہیں وصل کی جویا ہی نہیں
پل سے جنھیں پار اترنے کی تمنا ہی نہیں
اس کا یارا ہی نہیں!(18)

سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسے لوگ جنھیں راشدؔ منفی انسان کہہ کے پکارتے ہیں، ان میں منفیت (جو، ان کا جوہر ہے) کہاں سے آئی؟ آیا یہ وراثت میں ملی؟ حیاتیات یا سماج نے دی یا پھر کچھ دیگر عوامل کار فرما ہیں۔ اس سوال کا جواب وجودیت کے قائد سارتر سے لیتے ہیں کہ ایسا کیوں ہے؟:

"اگر لوگ ہمارے ادب کی مذمت کرتے ہیں جس میں ہم رزیل، کمزور، بزدل اور بسا اوقات بالکل برے کردار بھی پیش کرتے ہیں تو لوگوں کی مذمت کا سبب یہ نہیں کہ ہمارے ادبی کردار رزیل، کمزور، بزدل اور بداطوار ہیں۔ آیئے ہم فرض کرلیں کہ زولا کی مانند ہم بھی یہ دکھاتے کہ ان کرداروں کے طرزِ عمل کا سبب ان کی وراثتیا حالات کا نتیجہ اور عضوی یا نفسیاتی عوامل ہیں تو لوگ مطمئن ہو جاتے اور کہتے کہ آپ نے دیکھا ہم ہیں ہی ایسے۔ اس پر کسی کا بس نہیں "لیکن ہوتا یہ ہے کہ جب وجودی ادیب کسی بزدل کا کردار پیش کرتا ہے تو اسے اپنی بزدلی کا ذمہ دار بھی قرار دیتا ہے۔ اس کی بزدلی کا سبب کمزور دل، پھیپھڑے یا دماغ نہیں ہوتا۔ وہ اپنی جسمانی ساخت کی بنا پر بزدل نہیں بنتا۔ وہ تو بزدل اس لیے ہوتا ہے کہ اس نے اپنے اعمال کے ذریعے خود کو بزدل بنا لیا ہے۔ بزدل مزاج جیسی کسی شے کا وجود نہیں (19)"

پس طے ہو گیا کہ ان منفی انسانوں کی منفیت (Negativity) خود زائیدہ ہے۔ یہ جوہر ان کا خود منتخب کردہ ہے۔ کوئی انسان پیدائشی منفی نہیں ہوتا اور نہ ہی سماجی عوامل اسے منفی بناتے ہیں۔ ماحول کے جبر کا انسانی شخصیت کی تشکیل میں کوئی دخل نہیں ہے بلکہ یہ ایسے لوگ ہیں جنھوں نے اپنی آزادی سے صرفِ نظر کیا اور روایت کے خول میں عافیت محسوس کی۔ راشدؔ اس عنصر کے متلاشی ہیں جو انسانوں کو ایسا طرزِ عمل اختیار کرنے پر مجبور کیے ہوئے ہے اور بالآخر وہ ایک فیصلے پر پہنچتے ہیں:

روایت کی لوریوں نے
کلام کی روشنی کو ان پر
سُلا دیا ہے(20)

راشد اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہ ایسے لوگوں کا گروہ ہے جو روایت کے سیل میں بہنا پسند کرتا ہے، روایت کے خلاف بغاوت کا حوصلہ نہیں رکھتا، ایسے لوگ انسانیت پر بدنما دھبا ہیں اور ان کا صرف ایک ہی حل ہے کہ ان کی اجل سے ملاقات کروادی جائے۔ فعالیت اور تحرک کی موت کے ساتھ ساتھ فرد کے تشخص کی گم شدگی کا نوحہ بھی راشد کی نظموں کا اہم موضوع ہے۔ صنعتی اور سائنسی انقلابات نے فرد کا تشخص چھین کر اُسے اجتماعیت کی بھینٹ چڑھا دیا، اسی سبب وجودیت اس رویے کے خلاف احتجاج کناں ہے۔ وجودیت کے مکتبہ فکر کے بانی سورین کیرکے گارڈ نے فلسفہ کی بنیاد ہی انفرادیت پر رکھی۔ ہیگل کی اجتماعیت کے خلاف آواز اٹھائی اور معروضیت کی بجائے موضوعیت پر اصرار کیا۔ وجودیت روزِ اول سے محمود و ایاز کو ایک ہی صف میں کھڑا کرنے کے مخالف رہی ہے۔ راشد بھی فرد کے تشخص کی گم شُدگی کو فرد کی موت سے تعبیر کرتے ہیں:

کچھ اشتراکی،
کچھ ان کے احساں شناس مُلّا
بجھا چکے ہیں جو اپنے سینے کی شمع ایقاں!(21)

اشتراکیت کے ساتھ اُس اجتماعیت پر بھی طنز کی جارہی ہے جس کے یہ لوگ پرچارک ہیں۔ راشد کے بقول ان کے اپنے سینے کی شمعیں تو بجھ چکی ہیں (یعنی انفرادیت نہیں رہی) اب یہ باقی انسانوں کو بھی تباہ کرنے پہ تُلے ہوئے ہیں۔ لوگوں کو اجتماعیت کا درس دیتے ہیں تاکہ ان کی انفرادیت اور تشخص ختم ہو جائے۔ جب کہ انفرادیت اور تشخص ہی تو نئے انسان کی پہچان ہے۔ راشد شکوہ کناں ہیں:

کچھ خواب کہ مدفون ہیں اجداد کے خود ساختہ اسمار کے نیچے
اجڑے ہوئے مذہب کے بِنا ریختہ اوہام کی دیوار کے نیچے(22)

راشد کو تاسف ہے کہ اسلاف کی فرسودہ کہانیوں، روایات اور مذہبی اقدار نے مل کر انسان کی انفرادیت کو شدید متاثر کیا۔ نئے انساں نے اس جبریت سے بغاوت کی۔ داخلیت پر تیقن بڑھا تو خارج کا جبر بتدریج کم ہونے لگا اور پھر زندگی کے سفر میں باطن مشعلِ راہ بنا۔ فردِ آزاد اپنی اقدار خود تشکیل دینے لگا اور یوں انسانی بے توقیری کے بادل چھٹنے لگے، نئے انسان کے نقوش ظاہر ہوئے جو کسی بھی طرح کی ملمع کاری سے پاک خالصتاً اس کے اپنے تھے۔ اسی سلسلے میں راشد کی نظم "سفر نامہ" دیکھی جاسکتی ہے، جہاں خُدا اور انسان ناشتے کی میز پر بیٹھے گفتگو کرتے ہیں:

ہمیں یہ خبر تھی بیان و حرف کی خُو اُسے
ہمیں یہ خبر تھی کہ اپنی صوتِ گلو اسے
ہے ہر ایک شے سے عزیز تر(23)

نظم میں پیش کی گئی صورتِ حال میں انسان کی حیثیت ثانوی ہے اور پھر خدا کا تمام وقت اپنی گفتگو میں مشغول رہنا جب کہ انسان کا خاموشی کے ساتھ سننا غیر وجودی رویہ ہے۔ اس طرزِ عمل سے انسان کا تشخص مجروح ہوتا ہے۔ وجودیت تو انسان کو مرکزِ کائنات ٹھہراتی ہے اور تمام ایسی قوتوں کی نفی کرتی ہے جس کے سامنے انسان بے بس ہو جائے۔ اس پوری نظم میں انسان کی طرف سے گہری چپ ہے جو نئے انسان کا تشخص نہیں، نیا انسان تو اپنی تشکیل کردہ روایات و اقدار پر جیتا ہے:

ستم یہ کہ اس کے لیے آج،
ملّائے رومی کے،
مجذوبِ شیراز کے
زنگ آلودہ اوہام بھی

دست گیری کو حاضر نہیں(24)

یہاں راشد کی اس انفرادیت کا ظہور ہوا ہے جو وہ نئے انسان میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ دوسروں کی متعین کردہ راہوں پہ نہیں چلا جا سکتا۔ ملّائے رومی اور مجذوب شیراز کے افکار جنھیں راشد زنگ آلودہ اوہام سے تعبیر کر رہے ہیں نئے انسان کی دست گیری نہیں کر سکتے۔ نیا انسان اپنے عہد کے مسایل کا حل خود اپنی تدبیر سے بہتر ڈھونڈ سکتا ہے۔ زوال آفریں اقدار نئے مسایل سے نبرد آزما نہیں ہو سکتیں لہٰذا راشد انھیں بلا تامل رد کر دیتے ہیں اور یہی رویہ نئے انسان سے مخصوص ہے جو اُس کی انفرادیت پر دال ہے۔ راشد کو اپنی انفرادیت بہت عزیز ہے کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ اگر یہ نہ رہی تو سب ختم ہو جاے گا:

بہشت میں بھی نشاط، یک رنگ ہو تو، غم ہے
ہو ایک سا جامِ شہد سب کے لیے تو سم ہے(25)

راشد انفرادیت کا گہرا شعور رکھتے ہیں تبھی تو وہ ایسا پیالہ شہد بلا تامل زہر قرار دیتے ہیں جو اجتماعیت کی بھیڑ میں گم کر دے۔ راشد کے نزدیک بقا صرف انفرادیت میں ہے اور پھر یہی انفرادیت نئے انسان کا طرہ امتیاز بھی ہے لہٰذا یہ انھیں ہر چیز سے مقدم ہے۔ راشد شعوراً کوشاں ہیں کہ ان کے ہر طرز عمل سے انفرادیت جھلکے اور وہ اس کوشش میں خاصے کامیاب بھی رہے، لیکن انھیں تاسف ہے کہ وہ اپنی انفرادیت سے زمانے کے افسوں زدہ برج کو توڑ نہیں پاے لیکن تاسف کی یہ لہر اتنی توانا نہیں کہ ان کی انفرادیت کو اجتماعیت کے آگے جھکا دے۔ وہ بہر حال پورے قد سے اپنی انفرادیت کا تحفظ کرتے ہیں:

انھیں کیا خبر کس دھنک سے میرے رنگ آے
مرے اور اس نوجواں کوزہ گر کے ؟
انھیں کیا خبر کون سی تتلیوں کے پروں سے
انھیں کیا خبر کون سے حسن سے ؟
کون سی ذات سے، کس خد و خال سے
میں نے کوزوں کے چہرے اتارے ؟
یہ سب لوگ اپنے اسیروں میں ہیں
زمانہ، جہاں زاد، افسوں زدہ برج ہے اور یہ لوگ اس کے اسیروں میں ہیں(26)

راشد نے انفرادیت کے حصول کے لیے آزادی کو استعمال کیا، اور آزاد انسان کی طرح فرسودہ روایات سے بغاوت کی۔ ان کی بغاوت بارے ڈاکٹر وزیر آغا کہتے ہیں:

"راشد کی نظم میں بغاوت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس نے ان روایات کو احتساب کی نظروں سے دیکھا ہے جو اس کے معاصرین کو نہایت مضبوط اور قیمتی دکھائی دیتی تھیں مثلاً خُدا کے بارے میں راشد کے ہاں بار بار ایک ناقابل فہم سرکشی کے جذبات ملتے ہیں"(27)

راشد کے تصورِ انسان پہ نظرِ غائر کریں تو راشد کی ناقابل فہم سرکشی کسی حد تک قابلِ فہم ہو جاتی ہے۔ راشد کا انسان تب تک مکمل نہیں ہوتا جب تک وہ خدائی مسند پر جلوہ افروز نہیں ہو جاتا۔ کسی کے متعین کردہ راستوں پہ چلنا نئے انسان سے ممکن ہی نہیں، چاہے راستوں کا تعین کرنے والا خدا ہی کیوں نہ ہو۔ اسی بنا پر راشد ان روایات کا احتساب ہی نہیں کرتے بلکہ انھیں یکسر رد بھی کر دیتے ہیں جو ان کے معاصرین گلے سے لگائے دکھائی دیتے ہیں:

اسی مینار کے سائے تلے کچھ یاد بھی ہے
اپنے بے کار خدا کی مانند
اونگھتا ہے کسی تاریک نہاں خانے میں
ایک افلاس کا مارا ہوا ملّائے حزیں
ایک عفریت-----اداس
تین سو سال کی ذلت کا نشاں
ایسی ذلت کے نہیں جس کا مداوا کوئی!(28)

نئے انسان نے اپنی اقدار کے ساتھ جینا سیکھ لیا، اپنے روشنی میں کائنات کو سمجھ لیا، اچھی بری ہر طرح کی صورت حال کی ذمہ داری قبول کر لی۔ اخلاقیات سے لے کر سماجی اقدار تک سب کچھ نئے انسان کا اپنا تخلیق کردہ ہے تو اس صورت حال میں اسے خدا کی مطلق ضرورتنہیں رہتی۔ یہی سبب ہے کہ نئے انسان کے لیے تصورِ خُدا بے کار ہو گیا ہے۔ بغاوت اور سرکشی کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو:

روایت، جنازہ
خدا اپنے سورج کی چھتری کے نیچے کھڑا
نالہ کرتا ہوا
جنازے کے ہمراہ چلتے ہوے
گھر کے بے کار لوگوں کا شور و شغب
ریاکار لوگوں کو شور و شغب کا سرور(29)

نئے آدمی نے کہنہ روایت کا جنازہ نکال دیا، روایات کا جنازہ جا رہا ہے اور خدا محو نالہ ہے، کیوں کہ یہی روایات اس کے بقا کی ضامن تھیں لیکن نئے انسان نے ان روایات سے ذرہ برابر بھی دل چسپی نہیں لی۔ اسے دل چسپی صرف اپنی ذات سے ہے شاید اسی لیے نئے انسان پر "مریضانہ

داخلیت "کا الزام بھی عاید کیا جاتا ہے۔ روایت کے اس جنازے پر بے کار اور ریاکار جنھیں راشد "منفی انسان "کہتے ہیں شور مچا رہے ہیں کیوں کہ وہ اسی روایت کے پروردہ ہیں۔ روایت کی گم شدگی یا موت ان کے وجود کو بے معنی بنادے گی، لیکن نیا آدمی اپنے اثبات کی ایک اور منزل طے کر کے نہایت مطمئن ہے۔ راشد کی بغاوت روایت کا جنازہ نکالنے پر رکتی نہیں بتدریج بڑھتی جاتی ہے اور وہ چلّا اٹھتے ہیں:

آج اپنے مختصر لمحے میں اپنے اس خدا کو
روبرو لائیں گے ہم
اپنے ان ہاتھوں سے جو ڈھالا گیا
آج آمادہ ہیں پی ڈالیں لہو
اپنا لہو(30)

بغاوت میں اب وہ فیصلہ کن موڑ آگیا ہے جہاں راشد، نئے انسان کی نمائندگی کرتے ہوے خدا سے "روبرو" ملاقات کے خواہاں ہیں تاکہ فیصلہ ہو جاے کہ اس "ناکارہ وجود" کو باقی رہنا چاہیے یا نہیں؟ لہجے کا تیقن بتا رہا ہے کہ وہ اپنے ہاتھوں کے تخلیق شدہ خدا کا خون پی کر اس کے وجود کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیں گے۔

تمام فرسودہ روایات واقدار کے خاتمے کے بعد نیا انسان اس سرزمین پر قدم رکھتا ہے جو اس کی اپنی تخلیق کردہ ہے، یہاں سب کچھ نیا اور اس کی منشا کے مطابق ہے۔ نئی روایات نئی اقدار اور نیا خدا۔۔۔ پرانے نظام کو کلی طور پر تج دیا گیا اور اب نیا انسان نئی حمد سننا چاہتا ہے:

میں تنہائی میں کر رہا تھا
پرندوں سے باتیں
میں کہہ رہا تھا:
"پرندو، نئی حمد گاؤ
کہ وہ بول جو اک زمانے میں
بھونروں کی بُانھوں پہ اڑتے ہوئے
باغ کے آخری موسموں تک پہنچتے تھے
اب راستوں میں جھلسنے لگے ہیں
نئی حمد گاؤ"(31)

گدائی سے خدائی تک سفر میں متعدد ایسے مقامات بھی آتے ہیں جب لغویت کا احساس آگھیرتا ہے۔ تمام کیا دھرا لغو محسوس ہوتا ہے۔ انسان اپنی ہستی موجود کو معنی دینے سے قاصر ہوتا ہے۔ لغویت ایک اہم وجودی صورت حال ہے جس سے نیا انسان دوچار ہے۔ راشد

بھی لغویت کا شکار ہوتے ہیں لیکن وہ جلد اس پر قابو پا لیتے ہیں۔ ان کی نظموں میں یہ سعی واضح طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔ وہ کہیں بھی لغویت کے احساس کو حاوی نہیں ہونے دیتے:

کوئی مجھ کو دورِ زمان و مکاں سے نکلنے کی صورت بتا دے
کوئی یہ سجھا دو کہ حاصل ہے کیا ہستی رائیگاں سے ؟
شام سے پہلے ہی کر دیتا تھا میں
چاٹ کر دیوار کو نوکِ زباں سے ناتواں
صبح ہونے تک وہ ہو جاتی تھی دوبارہ بلند(32)

راشد کو احساس ہے کہ وہ کارِ لاحاصل میں مصروف ہیں لیکن ان کی نظموں کی عمومی فضا میں تحرک و فعالیت ہے۔ وہ آزای کے نغمے گاتے اور نئے انسان کا والہانہ استقبال کرتے نظر آتے ہیں۔ راشد کا انسان بے بس، لاچار اور مجبورِ تقدیر نہیں بلکہ تقدیر بنانے والا ہے۔ پورا نظامِ کائنات اس کے تابع ہے اور وہ پورے کر و فر سے مسندِ خداوندی پہ جلوہ افروز ہے۔ مختصراً راشد نے فلسفہ وجودیت کا نہ صرف بھرپور انجذاب کیا بلکہ شاعری میں اس کا اظہار بھی کیا لہٰذا راشد بشر مرکزیت (Humanism) کا توانا نمائندہ اور ماڈرن اسٹ شاعر ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ بُوئے آدم زاد، کلیاتِ راشد، ماورا، لاہور، ۲۰۰۸، ص ۱۰۳
۲۔ بے مہری کے تابستانوں میں، کلیات راشد، ص ۹۴۳
۳۔ ایک زمزے کا ہاتھ، کلیاتِ راشد، ص ۲۶۵
۴۔ نیا آدمی، کلیاتِ راشد، ص ۳۱۵
۵۔ فطرت اور عہدِ نو کا انسان، کلیاتِ راشد، ص ۹۳
۶۔ اتفاقات، کلیاتِ راشد، ص ۸۶
۷۔ حزنِ انساں، کلیاتِ راشد، ص ۱۷
۸۔ انسان، کلیاتِ راشد، ص ۴۲
۹۔ سپاہی، کلیاتِ راشد، ص ۷۷
۱۰۔ گناہ، کلیاتِ راشد، ص ۸۸

۱۱۔ رقص، کلیاتِ راشد، ص ۱۰۰

۱۲۔ شاعرِ درماندہ، کلیاتِ راشد، ص ۳۹

۱۳۔ عالم خوندمیری، ''ن۔م راشد : انسان اور خدا''، مشمولہ ن۔م راشد : شخصیت اور فن، مرتبہ مغنی تبسم، شہریار، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۸۹۱، ص ۸۰

۱۴۔ پہلی کرن، کلیاتِ راشد، ماورا، لاہور، ۲۰۰۸، ص ۱۳۰

۱۵۔ تعارف، کلیاتِ راشد، ص ۵۹۲

۱۶۔ افسانۂ شہر، کلیاتِ راشد، ص ۹۳۳

۱۷۔ ایضاً، ص ۲۱۲

۱۸۔ نئے گناہوں کے خوشے، کلیاتِ راشد، ص ۴۰۵

۱۹۔ ژاں پال سارتر، ''وجودیت اور انسان دوستی'' مترجم قاضی جاوید (، مشمولہ سارتر کے مضامین، ص ۴۵۔ ۳۵۲

۲۰۔ میرے بھی ہیں کچھ خواب، کلیاتِ راشد، ص ۷۸۲

۲۱۔ سفر نامہ، کلیاتِ راشد، ص ۳۵۴

۲۲۔ درویش، کلیاتِ راشد، ص ۶۲۲

۲۳۔ وہ حرفِ تنہا، کلیاتِ راشد، ص ۸۲۳

۲۴۔ حسن کوزہ گر ۴، کلیاتِ راشد، ص ۲۴۵

۲۵۔ ایضاً، ص ۲۸۴

۲۶۔ دریچے کے قریب، کلیاتِ راشد، ص ۶۹

۲۷۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، ''بغاوت کی ایک مثال ن۔م راشد''، مشمولہ نظم جدید کی کروٹیں، سنگت پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۶۴

۲۸۔ رات شیطانی گئی، کلیاتِ راشد، ص ۱۰۵

۲۹۔ رات شیطانی گئی، کلیاتِ راشد، ص ۱۰۵

۳۰۔ میں کیا کہہ رہا تھا، کلیاتِ راشد، ص ۴۶۴

۳۱۔ خودکشی، کلیاتِ راشد، ص ۱۱۱

۳۲۔ ایضاً، ص ۱۱۸